دولت کا کرم بھوگ توڑ کر نروان حاصل کرنا چاہتا تھا ـــــ اپنے آدرشوں کا حصہ اور کیسے بنا جا سکتا ہے؟ اسی طرح ایک بار پہلے بھی اس نے سوچا تھا۔ تب وہ ابھی کالج میں پڑھتا تھا اور اپنے باپ کی تحریکوں کو اچنبھے کی نظر سے دیکھتا تھا ـــــ ابھی اس نے ان تحریکوں کمیٹیوں، جلسوں، میٹنگوں کے پیچھے اپنے باپ کی انا کا ہنٹر نہیں دیکھا تھا۔

وہ نچلے صحن میں اپنے آباو اجداد میں سے دفن کسی ایک کی قبر پر بیٹھا تھا جب اس نے سنتو جمعدارنی اور اس کے بچے کو دیکھا۔ ننگ دھڑنگ سیاہ بچہ دسمبر کی سردی میں ٹھنڈے فرش پر بیٹھا رو رہا تھا اور سنتو آنگن کے نلکے میں نیلی ٹیب لگا کر صحن دھونے میں مشغول تھی۔ جب بچے کی چیخ گلوگیر ہو جاتی تو سنتو جھاڑو چھوڑ کر آتی، جھولی میں ڈالے ہوئے مالٹے کی ایک پھانک نکالتی، بچے کو پکڑاتی اور واپس کام پر چلی جاتی ـــــ کچھ تو بچے کو ایسی فریبی ماں پر غصہ تھا۔ کچھ ابھی وہ اپنے ہاتھوں سے ٹھیک طور پر کھانے جوگا نہ ہوا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ پھانک کو منہ میں ٹھونسنے کی ترکیب کرتا لیکن جب یہ ٹھونسنے چوسنے کا عمل درستگی سے نہ ہو پاتا تو سنتو کا بالک پھر منہ کھول کر رونے لگتا۔ کچھ عرصہ تک تو ابراہیم یہ کرشن لیلا دیکھتا رہا۔ پھر جب ایک بار سنتو غسلخانے میں بالٹی لینے گئی تو اس نے اس موت سے سنے بچے کو اٹھایا اور پرکھوں کی قبر پر رومال بچھا کر اپنے پاس بٹھایا اور چلغوزے چھیل چھیل کر کھلانے لگا۔ بچے نے شاید اس سے پہلے اتنی قدر و منزلت اس گھر میں کبھی نہ پائی تھی۔ وہ جب سے پیدا ہوا تھا اس گھر میں متواتر آر ہا تھا اور ٹھنڈے فرشوں پر رو رو کر وقت گزارنے کا عادی تھا۔ ابراہیم کے پاس بھی بہلانے کے لیے کچھ اور چیز سر دست نہ تھی۔ وہ احتیاط سے چلغوزے چھیلتا اور بچے کے لعاب سے لتھڑے منہ میں ڈال دیتا ـــــ پتہ نہیں یہ کھیل کب تک جاری رہتا لیکن اوپر والی منزل سے دادی اماں کی کڑک دار آواز آئی:

"ابراہیم ـــ!"

"جی دادی ماں!"

"ذرا اوپر آؤ"۔

"جی میرے کالج کا ٹائم ہو گیا ہے"۔

"بس ذرا دیر کے لیے ۔"

ابراہیم اوپر دادی کے کمرے میں گیا۔

دادی کا کمرہ ساری حویلی کا دارالخلافہ تھا۔ یہاں بڑے اہم فیصلے ہوتے تھے۔ یہاں قسمتیں، جائیدادیں، شادی بیاہ، دوستی دشمنی کے تمام ریکارڈ رکھے جاتے تھے۔ دادی بڑی پُر وقار خاتون تھیں۔ اس نے اس عہد میں پانچ بہوؤں کو حویلی سے بچھڑنے نہیں دیا تھا۔ عقابی نظروں سے گھر کے تمام انتظامات پر غور کرتی رہتی تھی۔ اس اتفاقی سرکشی کو بھی اس نے اوپر والی منزل سے عین وقت پر دیکھ لیا تھا اور دادی حصّہ رسد بانٹنے میں ہمیشہ جلدی کرتی تھی۔ دادی کا مقولہ تھا کہ سپنولیا مار دو۔ سانپ آپی مر جائے گا۔ چھوٹی سی کوتاہی پر بڑا سا ڈھیلا مارو تاکہ چشمہ ندی اور ندی تالاب نہ بنے۔

جب ابراہیم پورے تین گھنٹے دادی کے پلنگ پر بیٹھا رہا اور اس کے چار پیریڈ ضائع ہو گئے تو وہ تیسرے ملک کے کسی ایسے ڈیلی گیٹ کی طرح اٹھا جس کی پیشی مجبر پاورز کے سامنے رہی ہو۔

"بیٹا ــــ ! کان کھول کر آخری بار سُن لو ــــ خاندان کی عزت کوئی ایک پشت نہیں بناتی۔ یہ کئی پشتوں کا ثمر ہے جو تم لوگوں تک پہنچا ہے ــــ میں تمہیں اس قدر خود غرض نہیں ہونے دوں گی کہ پائی پائی جوڑی پونجی کو یوں برباد کرنے دوں ــــ تمہارا باپ کچھ کم خدا ترس نہ تھا۔ ساری عمر لاکھوں خرچ کیا غریبوں پر ــــ کئی گھرانے پال دیے۔ کئی نخمۂ یکیں چلائیں۔ کتنی کمیٹیاں بنائیں لیکن خاندانی وقار کو قائم رکھ کر ــــ کچھ اپنی روایات کو ملیامیٹ نہیں کیا۔ تمہاری عمر چھوٹی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ ان کمینوں کو اگر منہ لگایا جائے تو یہ سر پر آن بیٹھتے ہیں۔"

ابراہیم نے ابھی تازہ تازہ دینی کتابوں میں سے اخوت کا سبق حاصل کیا تھا اس لیے وہ گڑبڑا گیا۔ ویسے بھی وہ بحث کرنے کا عادی نہ تھا۔ اسے نہ کسی نکتۂ نظر سے شدید محبت تھی نہ ہی کسی خاص نظریے سے شدید قسم کی نفرت تھی۔ وہ چھوٹی عمر میں ہی جان گیا تھا کہ انسانی کوشش کا ثمر تمام تر میٹھا کبھی نہیں ہوتا۔ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اس میں آگے چل کر کئی رکاوٹیں، کئی سقم، کئی خامیاں خود بخود ہی کہیں سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ چناؤ کے معاملے میں بنی نوع انسان کی قسمت ہی کچھ ایسی تھی۔ وہ ہر خوشی میں کہیں نہ کہیں تھوڑا غم بھی چن لیتے تھے اور ہر غم کے اندر ہی اندر کہیں نہ کہیں تھوڑی سی چھپی ہوئی خوشی بھی سمیٹ لیتے ہیں اس لیے اس نے دادی کے نکتۂ نظر پر اعتراض، بحث، کٹ حجتی کچھ بھی نہ کی اور اپنا رویہ بدل لیا۔ اب وہ ساری حویلی میں ایک نمی سی مسکراہٹ لیے چلتا پھرتا۔ کوئی بھی اسے گھر کے کسی رام روے میں شمولیت پر آمادہ نہ کر سکا۔ وہ تیسری منزل پر رہتا اور اپنی کتابوں کے علاوہ کسی سے علاقہ نہ رکھتا۔ کبھی کبھی تھکن سے چور وہ باہر نکلتا اور شہ نشین پر ایک ٹانگ رکھ کر نیچے گلی کا منظر دیکھنے لگتا۔

اس شام بھی ہلکی ہلکی بارش ہوئی تھی اور بھیگی رات میں ماتم کناں لوگوں کی آوازیں پچھلی ڈھلوان گلی سے ہو کر شہ نشین تک آ رہی تھیں۔ اس اونچی ماڑی سے اردگرد کا سارا محلہ بخوبی نظر آتا تھا۔ گلی میں اینٹوں پر پھسلن تھی۔ کچھ بچے تھوڑی دیر پہلے خاکی لفافے، مونگ پھلی کے چھلکے اور چند باسی شکر قندیاں گلی میں پھینک کر جا چکے تھے۔ پھر گلی کی نکڑ پر ایک وہیل چیئر نظر آئی۔ اس کرسی میں ایک معذور لڑکی بیٹھی تھی اور اس سادھنی کو ایک بیس بائیس برس کا گہرا سانولا لڑکا دھکیلتا چلا آ رہا تھا۔ نوجوان مدقوق صورت تھا اور اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ شاید اس سے پہلے بھی اس نے کئی بار اس معذور لڑکی اور مدقوق نوجوان کو دیکھا تھا لیکن اس شام جب وہیل چیئر گلی کی چڑھائی پہ ابھری تو پہلی بار ابراہیم کو خیال آیا کہ شاید یہ لڑکی چل پھر نہیں سکتی۔ ابھی وہ نیوی بلو پینٹ اور نیوی بلو لڑکے کے متعلق کچھ واضح سوچ بھی نہ پایا تھا

کہ ڈھلوان، پھسلن اور جھٹکوں کی وجہ سے وہیل چیئر نے ایک لڑھکنی کھائی۔ لڑکی منہ کے بل گری اور وہیل چیئر اپنے مومنٹم سے بے بس الٹی سیدھی ہوتی نیچے کی طرف سرپٹ جانے لگی۔

جتنی سرعت سے کرسی نیچے جارہی تھی اتنی تیز رفتاری سے ابراہیم نے سیڑھیاں اترنی شروع کر دیں۔ وہ لمحے کا آدمی تھا۔ زیادہ ٹیوے لگانے کی اس میں صلاحیت نہ تھی کسی کسی لمحے ہونی کے سواگت میں وہ ایسے آگے جاتا کہ پچھلی سوچ سے اس کا عمل یک دم الٹ ہوجاتا اور وہ لوگ جو اسے جانتے تھے اس کا عمل سمجھ نہ پاتے۔ جس وقت اس نے لڑکی کو منہ کے بل گرتے دیکھا وہ بالائی منزل سے چیتے کی طرح لپکا اور راولمپک کھلاڑی کی طرح گلی کی چڑھائی پر بھاگنے لگا۔ گلی میں دو چار دکانیں بھی تھیں جن میں رنگ ساز، پکوڑے تلنے والا اور سبزی فروش اس حادثے سے بے خبر گاہکوں سے باتیں کرنے میں مشغول تھے لیکن چند بچے اس سے پہلے پہنچ گئے تھے اور وہیل چیئر کو اونچائی کی طرف لے جانے میں مصروف تھے۔ جب ابراہیم جائے حادثہ پر پہنچا، لڑکی پہلو کے بل پڑی تھی اور بے ہوش تھی۔ اس کی ناک اور منہ سے لہو رواں تھا اور وہ گردن چھوڑے پڑی تھی۔ نیوی بلولڑکا اپنے کیسری مفلر سے اس کا چہرہ صاف کر رہا تھا۔

جب بھی ابراہیم پر لمحہ سوار ہوتا اسے خود سمجھ نہ آتی کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ اس نے لڑکی کا خوف ناک چہرہ دیکھا اور پھر تھبتہ بھر کر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ جس رفتار سے وہ بغلی گلی میں کھڑی اپنی کار تک پہنچا اور جس تیزی سے اس نے لڑکی کو پچھلی سیٹ پر پٹک کیا یہ سب کچھ بھی صرف لمحوں کی بات تھی۔

جب وہ مال روڈ پر کاریں بچاتا تیزی سے جا رہا تھا ـــــ تو پہلی بار اسے احساس ہوا کہ شاید وہ ہسپتال جا رہا ہے۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں ـــــ؟" سریلی آواز میں لڑکی نے سوال کیا۔

ہسپتال :

"اچھاجی ۔۔۔!"

شاید وہ لڑکا ساری زندگی سے اچھاجی کہنے کا عادی تھا۔

جس وقت ایمرجنسی کا سٹریچر لایا گیا اسے پورا یقین تھا کہ لڑکی راستے میں ہی کہیں فوت ہو چکی ہے۔ اس کے چہرے اور کپڑوں پر جما ہوا خون تھا اور گردن ایسے مڑی ہوئی تھی جیسے مروڑی گئی ہو۔

"آپ جا کر یہ ٹیکے لے آئیں ۔۔۔ جلدی سے جلدی۔" ڈاکٹر نے اسے ایک پرچی تھما کر کہا۔

لیکن جب وہ باہر جارہا تھا تو نرس نے اپنی پٹاخے دار آواز میں ہنس کر کہا:

"ڈاکٹر صاحب! اب یہ آچکا۔ یہ لوگ ایکسیڈنٹ کر کے غائب ہو جاتے ہیں ہمیشہ۔"

نیوی بلو لڑکا سنتا کر کچھ بولا لیکن آواز اس تک نہ پہنچ سکی۔ ابراہیم کے جی ایس آئی کہ ہسپتال پہنچانے کے بعد مزید جھمیلوں میں پڑنے کے بجائے وہ حادثہ کرنے والوں کی طرح بھاگ ہی جائے لیکن وہ زیادہ دیر تک گریز کی الاٹوں پر سوچنے کا عادی بھی نہ تھا۔ لڑکی کی مرہم پٹی بھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ وہ ٹیٹنس کا ٹیکہ اور دوائیاں لے کر واپس بھی آ گیا۔ لڑکا ابھی تک اپنے کیسری مفلر سے لڑکی کے بازو پونچھنے میں لگا ہوا تھا۔

یہ دونوں بہن بھائی بھی عجیب قسم کی مخلوق تھی، جیسے برصغیر کی ڈکوت جاتی کے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ برہمن، کچھ گجر، کچھ ساکنسی لوگوں کی ملاوٹ سے بنا ہوا قبیلہ ۔۔۔ ایسے ہی نسیم اور منظور بھی ان ہی ملاوٹوں سے بنے تھے۔ رنگتیں کول بھیل دراوڑوں کی تھیں۔ چہرے کے نقوش تیکھے اور کاٹھ لوگوں کی یاد دلاتے تھے۔ تاعوامی تھے۔ زبان پنجابی آمیز اردو تھی۔ لباس بھڑکیلے رنگوں کا تھا جن رنگوں کے پیچھے انھوں نے اپنی غریبی چھپا رکھی تھی اور ساری شخصیتیں احتیاج، مجبوری، کسر نفسی، مظلومیت اور بیچارگی کے خمیر سے گندھی تھیں۔

اگر ابراہیم سمپورن راگ تھا تو نسیم فقط ایک چیخ تھی۔ جس طرح چلتی کار کسی کتے کے اوپر سے گزرے تو بکتے سسٹم سے لگتی ہے۔ سوسائٹی کے خلاف، فطرت کے خلاف خود اپنے وجود کے خلاف یہ چیخ مارتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ منہ پر دھر لیا تھا اور آواز کو دوسرے لوگوں کے کانوں تک پہنچنے نہ دیا تھا۔ ابراہیم چھل دروازوں والی حویلی میں رہتا تھا ایسی حویلی جس کے اندرونی آنگن میں اسلاف کی چند بچتہ قبریں تھیں جن پر گھر کے بچے بیٹھ کر تختیاں لکھا کرتے اور گھر کی بڑی بوڑھیاں انہیں اٹھا اٹھا کر کہتیں:

"ہائے کیا زمانہ ہے اپنے بزرگوں کی قبروں پر بیٹھتے شرم نہیں آتی۔ ایک تو تمہاری ماؤں کو سنبھالنے کا طریقہ نہیں آتا ___ کھلا چھوڑ رکھا ہے بچوں کو۔ نہ کوئی عقل نہ موت۔"

بچے تھوڑی دیر کے لیے قبروں سے دور ضرور ہو جاتے لیکن پھر یہی قبریں کھیل کا مرکز بن جاتیں۔ اونچ نیچ کا کھیل تو ان قبروں کے بغیر کھیلا ہی نہ جا سکتا تھا۔ کٹی پشتوں سے گھرانہ اکٹھا تھا اور اس کی سالمیت کی وجہ سے دوسرے گھرانے ان سے ڈرتے اور بد کتے تھے۔ اس گھرانے میں پیار اور نفرت دونوں متوازی پٹڑیوں پر بچھی تھی اور گھرانے کی عظمت اس کی روایات، اس کے سکہ بند اصولوں کی سند بڑی سپیڈ کے ساتھ واں! واں! اس پٹڑی سے گزر رہی تھی۔

اس حویلی میں گروہی اور انفرادی زندگی دونوں کے امکانات بہت روشن تھے۔ جو افراد رانا سانگا کی طرح مردِ میدان تھے وہ معرکوں کا وقت گزر جانے کے بعد آنگن میں پلنگوں پر تخت پوشوں پر نیم دراز ٹولیوں میں بیٹھتے اور اپنے اپنے تجربات کے زخم ایک دوسرے کو دکھاتے۔ داد دیتے اور وصول کرتے۔ جن کو خاموشی، تنہائی اور اپنی ہی جلد میں غائب ہو جانے کا شوق ہوتا وہ اس گھر میں SNAIL کی طرح اپنے جسم میں ہی اپنا گھر اٹھائے پھرتے ادھر لوگوں کی یورش ہوتی اور وہ اپنی ہی جلد اپنی ہی آنکھوں اور اپنے ہی ناخنوں کے اندر

غائب ہو جاتے۔

ابراہیم کی ماں دادی کی منظورِ نظر تھی ـــــ سب سے بڑی بہو ہونے کے ناطے بھی اس کی زندگی پٹ رانیوں کی طرح گزرتی۔ وہ پانچ فٹ نو انچ اونچی اور بڑی گھیرے دار عورت تھی۔ اس کی انگوٹھیوں سے لدے ہاتھ، بھاری بھاری گول بانہیں، امتناعی اشاروں میں کھلتی بند ہوتی رہتیں۔ دراصل دادی اس سے ایسے ڈرتی تھی جیسے ملک کا صدر پرائم منسٹر سے بدکتا ہے ـــــ لیکن اس بیگما کے گھر جب ابراہیم جیسا انوٹھا بیٹا پیدا ہو گیا تو وہ بہت تلملائی۔ ابراہیم سرمہ تھا۔ آنکھوں میں پھرتا رہتا لیکن تکلیف نہ ہوتی۔ چھوٹا تھا تو پہروں نچلی قبروں پر بیٹھا رہتا۔ نہ کسی سے جھگڑتا نہ کھانے کو کچھ مانگتا۔ اس کی گرانڈیل ماں اسے بڑا سسکارتی لیکن وہ کچھ ایسی ٹھنڈی مٹی کا مادھو تھا کہ اس تین منزلہ حویلی کے تکبر میں گوندھا ہی نہ گیا۔ پڑھائی میں اتنا تیز تھا کہ ماں کو آنکس مارنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ عادات تربیت کے بغیر من موہنی تھیں۔ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا لیکن شوہر کی موت کے بعد ابراہیم کی ماں خوش نہیں تھی۔ وہ منوانے والوں میں سے تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ابراہیم حویلی میں ویسے ہی مانا جائے جیسے اس کے ابا جی کا دبدبہ تھا۔ اوپر نیچے غلام گردشوں میں ابراہیم کی ماں کا ایک تہلکہ تھا۔ زبان درازی میں وہ حرفِ آخر تھی۔ اس پھاڑ کھاؤ نے بڑی کوشش کی کہ ابراہیم جو اکلوتا بھی تھا کچھ ریڑھ کی ہڈی مضبوط کر لے اور باپ کی جگہ جلد از جلد پُر کر دے لیکن اس لڑکے کو آنکھ بھوں ٹیڑھی کرنے کی عادت نہ تھی۔ بھی بھی اچھی طبیعت والے لڑکے کی اس اچھی گزران پہ ماں کا دل کٹ کٹ جاتا۔ چونکہ ابراہیم میں ایسا کوئی نقص نہ تھا جس پر حرف گیری کر سکتی اس لیے دل ہی دل میں کڑھتی۔ دعائیں مانگتی کہ یا میرے مولا! اس چھچھوندر کو تو ہاتھی کی سخت جلد عطا کر۔ کچھ تو اسے بھی حویلی والے محسوس کریں۔ کچھ تو یہ بھی اودھمی ہو کہ دوسروں کو اس کا پاس رہے ورنہ جب بڑا ہو گا تو اس بڑے پریوار میں، اس کھلے دربار میں، لوگوں سے لدی پھندی حویلی میں اس کی جریب جریب چلتی بات کو کون سنے گا!

لیکن ابراہیم میں نہ جانے کیا نقص تھا۔ وہ کندھا مارے بغیر، اونچا بولے بنا ہی وقت گزارتا رہا۔ پتہ نہیں یہ ماں کی شخصیت کا ردِ عمل تھا کہ باپ کے آدرشوں سے ناکام محبت تھی وہ اشتی جوانی میں بوسیدہ نظر آنے لگا۔ جب وہ چھوٹا تھا تو قبروں کے اردگرد گھومتا تھا۔ جب تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے باپ کا بزنس سنبھالا تو تیسری منزل میں کابوس صورت، سنیاس روپی رہنے لگا۔ تیسری منزل تک بھنور ڈالتے ماں کم ہی جاتی تھی۔ حویلی کی زندگی اس کے اردگرد کی بھنبھناہٹ تھی۔ چونکہ ابراہیم کے ہاتھ میں نفرت یا محبت کی آری یا کٹاری نہ تھی اس لیے وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑے سے بڑا معاہدہ کر سکتا تھا اور بڑے سے بڑے وعدے کو ایفا کیے بغیر بھی گزر بسر کر سکتا تھا۔

لیکن منظور اور نسیم سے ملنے کے بعد اس کی زندگی میں ایک چھوٹا سا طوفان آ گیا — آج تک جس فائل پہ ایک بھی مخالفت کا حرف نہ لکھا گیا تھا، وہی فائل اب کمرے کمرے پھرنے لگی اور گھر کا ہر فرد جلے بجھے حروف میں اس پہ نوٹنگ کرنے لگا — وجہ صرف اتنی تھی کہ وہ حویلی کے پچھواڑے والی گلی میں منظور کے گھر کبھی کبھی جانے لگا تھا۔

لیکن منظور کے گھر آنا جانا کچھ قصداً نہ تھا۔ جس دن وہ نسیم کو ایمرجنسی وارڈ میں چھوڑ کر حویلی لوٹا، ابراہیم ان دونوں کو بھلا چکا تھا۔ لمحہ گزرنے کے بعد وہ اس کا تابع نہ رہتا — دراصل ابراہیم نہ تو خوشی کی پھوار میں نہاتا رہتا نہ ہی غم کے تناؤ میں اپنے آپ کو کسنے کا عادی تھا وہ ان دونوں کیفیتوں کے عین درمیان کہیں آنند سے زندگی بسر کرنے کا قائل تھا۔ اس روز بھی جب نسیم وہیل چیئر سے گری اور ابراہیم ہسپتال سے گھر لوٹا تو جس وقت اس نے اپنی کافی پر کیو لیٹر کا بٹن دبایا، اس کے ساتھ ہی منظور کا سرکٹ کر گیا اور اس کی عام سادہ بیفکر زندگی کا کرنٹ بحال ہو گیا — لیکن منظور کی زندگی میں اتنی روشنی آ گئی کہ بے چارہ چندھیا گیا۔ منظور تمام بے آسرا لوگوں کی طرح ایک طاقت ور خاندان کے بغیر معاشرے کے انصاف سے تہی، دوستوں سے خالی زندگی گزار رہا تھا۔ اس لیے جب ابراہیم اس کے ساتھ ہسپتال

میں داخل ہوا تو وہ اسے گھٹتا بڑھتا چاند نہ سمجھا بلکہ اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پٹرومکس سمجھ بیٹھا۔ سارے محلّے میں بڑے ملک صاحب کا بیٹا ایک دیومالائی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے اردگرد کئی کہانیاں پھیلی تھیں۔ اس لیے منظور نے جب ابراہیم کو اتنے قریب سے دیکھ لیا تو اس نے اپنے تمام ملنے والوں کو حادثے کی ایک ایک تفصیل سنائی۔ کیسے ملک ابراہیم اسے اپنی سفید مرسیڈیز میں بٹھا کر ہسپتال لائے؟ ـــــ کیسے جاتے وقت انھوں نے جتائے بغیر نسیم کے سرہانے ایک ہزار روپے رکھے؟ ـــــ کیسے انھوں نے وارڈ کے تمام ڈاکٹروں کو بلا کر منظور کو اپنا محلّے دار بتایا؟

منظور کے لیے یہ حادثہ شکر گزاری کا موقع تھا۔ اتنی توجہ، اتنی عافیت اسے آج تک نہ ملی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت کار میں چڑھنے کا جھوٹا سچا خواب بھی نہ رکھتا تھا۔ نسیم کے چہرے پہ چھ انچ لمبا زخم نیا تھا لیکن وہ اندر باہر اتنے زخم کھا چکی تھی کہ اس حادثے کا اس نے بھی دل سے شکر یہ ادا کیا جس نے پورے ایکہزار روپے ایک بار دیکھنے کو تو دیے۔ ملک ابراہیم کے چہرے کو چھ فٹ قریب سے تو دیکھا۔

بہت امیر آدمی اور لاچار بے بس غریب آدمی کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ بہت چھوٹے واقعات پر اپنے خوابوں کی اساس رکھتا ہے۔ امیر آدمی اس لیے کہ اسے دنیاوی جدوجہد سے فراغت ہوتی ہے اور وافر وقت میں اس سے بہتر مصرف اور کوئی نہیں ہوتا ـــــ غریب آدمی چھوٹے واقعات کو زندگی کے نیک شگونوں میں سے سمجھتا ہے۔ ان سے خوابوں کو جنم دینا اس کے لیے کھڑی دھوپ سے بچ کر سائے میں بیٹھنے کا عمل ہوتا ہے

جب نسیم صحت یاب ہو گئی اور دوبارہ وہیل چیئر پر آنے جانے لگی تو ایک دن منظور ایک چھوٹا سا کیک شکرانے کے طور پر لے کر حویلی پہنچا ـــــ اس وقت وہ کنگ بجانے والوں کی طرح پسیجا پسیجا لگتا تھا۔ حویلی کے پہلو میں چور دروازہ تھا۔ سارا دن بڑا پھاٹک بند رہتا اور اسی بغلی دروازے سے آمد و رفت رہتی۔

منظور کے ہاتھ میں کیک کا ڈبہ تھا اور وہ اس دروازے کے آگے بھیک مانگنے والوں کی طرح کھڑا تھا۔ بڑی دیر وہ یونہی کھڑا رہا۔ آخر اس نے جرأت کر کے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بوڑھی ملازمہ باہر آئی ـــــ اور حقارت سے منظور کو دیکھ کر بولی:

"کیا ہے؟"

"ابراہیم صاحب ہیں؟"

"ہیں تو سہی لیکن آرام کر رہے ہیں"۔

منظور کا دل بجھ سا گیا۔

"کیا ہے؟" بڑے گھر کی ملازمہ تو آخر روز مکھوں میں رہتی تھی، ڈپٹ کر بولی۔

"یہ کیک انہیں دے دینا"۔

"انھوں نے یہ کیک کیا کرنا ہے۔ ان کو کیک بھیجے ـــــ"

بڑے آدمی کے ساتھ چھوٹا آدمی ایسے تیرتا ہے جیسے لکڑی کے ساتھ لوہا ـــــ لیکن منظور کے پاس ایسے تیرنے کی امید بھی باقی نہ رہی تو وہ بجھ کر بولا:

"بس تم یہ حقیر سا تحفہ انہیں دے دینا ـــــ کہنا منظور آیا تھا"۔

"کہہ دوں گی ـــــ"

کچھ لوگ جب اپنے گھر میں تیاری کرتے ہیں ـــــ کسی دعوت کا کھانا منگنی یا شادی کا انتظام، کسی سانحہ کا اہتمام تو اس وقت انہیں لگتا ہے کہ انتظامات بہت معقول ہیں اور مہمان اس اہتمام کو دیکھ کر بہت خوش اور متاثر ہوں گے لیکن مہمانوں کی آمد پر سارا انتظام نہایت بھونڈا، بے قیمت اور بے سُرا لگتا ہے۔ یہی احساس منظور کو واپسی پر ہُوا۔ جب اس نے اور نسیم نے مل کر کیک خریدا تھا تو ان دونوں کا خیال تھا کہ اس کیک سے خاطر خواہ طور پر شکریہ ادا ہو سکتا ہے اور اب واپسی پر اسے لگ رہا تھا کہ اس نے موٹی مائی کو کیک پکڑا کر ملک ابراہیم کی توہین کی ہے۔

شام کو ابراہیم تیسری منزل سے اترا۔ اس وقت تہمد باندھنے والی مضبوط جسم کی بوڑھی ملازمہ وہ کیک بچوں کو دے چکی تھی اور بچے کیک کے ٹکڑوں کو مٹھیوں میں بھینچ بھینچ کر اس کا چورا بنا رہے تھے اور ٹوبی کو کھلا رہے تھے۔

"اوئے احمقو! کیک کُتے کو کھلاتے ہیں کوئی؟" ابراہیم نے بغیر سختی کے ڈانٹ کر کہا۔

"کوئی بات نہیں ابراہیم بھائی! یہ کیک کھانا کس نے تھا؟"

"کیوں۔ میں کھا لیتا!"

"آپ کے کھائیں دشمن ـــــ وہ کالا منظور دے گیا تھا ـــــ منظور! آپ کیوں اس کے ہاتھ کا کیک کھائیں"۔

ابراہیم کے سامنے ایک بار ساری حویلی گھوم گئی۔ یکبارگی سب کچھ ڈول ـــــ کیا ہم اس قدر کاسٹ سسٹم کے شکار ہو چکے ہیں کہ اب اپنے سے نیچے والوں کے ہاتھ سے کچھ لے کر کھا بھی نہیں سکتے؟

اس سوال کے جواب میں ابراہیم منظور سے ملنے پچھواڑے کے ٹوٹے پھوٹے گھروں میں گیا۔

یہ ایک چھوٹی سی اناتھ بستی تھی۔ یہاں متعفن تنگ گلی کے ارد گرد ایک ایک دو دو کمروں کے کچے پکے مکان تھے۔ اسی گلی میں گول گپے والا مقیم تھا۔ یہیں گھر گھر کپڑے دھونے والی مائی صغرا اور اس کا سدا رُت بیمار بیٹا رہتا تھا۔ یہیں کئی ایسے ٹوٹے پھوٹے لوگ تھے جو زندگی کے ساتھ بغیر کسی قسم کی بھیک کے زندہ رہنے پر مجبور تھے۔

منظور کے گھر کے سامنے چھوٹے بورڈ پر لکھا تھا ـــــ "ریڈیو آرٹسٹ" ـــــ یہ اس نے محلے میں اپنی عزتِ نفس برقرار رکھنے کے لیے ٹانگ رکھا تھا کیونکہ عام زندگی میں اس کا ریڈیو سٹیشن سے کوئی دور کا تعلق بھی نہ تھا اور یہ بھی منظور کو صرف وہم ہی

تھا کہ لوگ اس چھوٹے سے بورڈ کو پڑھ کر کچھ اس کی عزت بحال کر دیں گے۔ سارا محلہ جانتا تھا کہ منظور کی ماں ایک چھوٹے درجے کی گانے بجانے والی عورت تھی جو گھر گھر شادی بیاہ پر جایا کرتی۔ پھر کچھ عرصہ بعد دھموں نے گانا بجانا چھوڑ دیا اور پیشہ کرنے لگی۔ اس میں بھی اتنا ادھار جمع ہو گیا کہ وہ پیشہ چھوڑ کر گھر بیٹھ گئی ـــــ لیکن منظور اور نسیم کی مجبوری نے اسے گھر گھر برتن مانجھنے پر مجبور کر دیا۔ اب منظور کی ماں بہت بڈھی ہو چکی تھی۔ وہ کئی بار آنگن میں ٹکے ہوئے دو خالی کنستروں سے ٹکرا جاتی۔ اسی لیے منظور خشک دودھ والے کی دکان پر کام کرنے لگا تھا۔ یہاں اس نے اپنا نام منظور قریشی بتا رکھا تھا لیکن دکان والے بھی گھاگ تھے۔ جس طرح مشرق کے لوگ دوسروں کی ہسٹری میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں، وہ بھی منظور کی پوری چھان بین کر چکے تھے اور اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے تھے جو اس کے سوشل سٹیٹس کے موافق آتا تھا۔

پہلے تو ابراہیم، ریڈیو آرٹسٹ منظور کے گھر از راہِ مروّت آیا۔ پھر بوڑھی دھموں کے اصرار پر ایک دو بار گیا۔ اس کے بعد منظور اور نسیم کی کس مپرسی کے باعث وہ ان کے گھر جانے پر مجبور رہا۔

ابراہیم کو ان تینوں روحوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ نسیم سے محبت کرنا تو درکنار راغب تک ہونے کا خیال نہ رکھتا تھا۔ اس کی منظور سے بھی کسی لیول کی دوستی نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ ان کے گھر جاتا رہا ـــــ وہ اپنے بڑے نام، بڑے خاندان کی تھوڑی سی عزت ان لوگوں میں بانٹنا چاہتا تھا ـــــ پھر وہ تینوں محض اس کے انتظار میں زندہ رہنے لگے۔ بہرکیف اس توقع سے اپنے آپ کو چھڑانے کے وہ قابل نہ تھا۔

ایک رات جب ابراہیم کی بیڈ رپورٹ دادی کے سامنے پیش کی گئی اور اس کے کاکچا چٹھا بیان کیا گیا تو آدھی رات گئے تک کانفرنس ہوتی رہی۔ صبح صبح دادی نے ابراہیم کو طلب کیا۔ ابراہیم دادی کے پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ گیا۔ وہ بڑے غصے سے ایک دو لائی

میں شگنے ڈال رہی تھی۔

"بیٹھو ـــــ" دادی نے کہا۔

بڑی دیر خاموشی رہی۔

"آپ نے بلایا تھا دادی ماں"۔

"ہاں ـــــ یہ کیا قصّہ ہے؟"

ابراہیم نے چند لمحے قصّہ کی نوعیت کے متعلق سوچا لیکن وہ اس قدر سالخوردہ نہ تھا کہ دادی کی بات سمجھ سکتا۔

"میں نے سنا ہے تو منظور کے گھر جاتا ہے"۔

کچھ کچھ بات گھونگھٹ کھول کر سامنے آ گئی۔

"کبھی کبھی ــــ"

"یہ جو بظاہر عزت والے لوگ ہوتے ہیں۔ انھوں نے کوئی مفت نہیں عزت دولت کمائی ہوتی۔ پیڑھیاں لگتی ہیں اور غریب لوگوں کا دل چاہتا ہے کہ چالاکی سے اس کے حصہ دار بن جائیں۔ بدنامی تو تیری ہو رہی ہے اس بیسوا کا کیا جائے گا"۔

"لیکن ہوا کیا ہے دادی ــــ"

"ہوا یہ ہے کہ بدنامی ہو رہی ہے ملکوں کی ـــــ نسیم پاپی کنواں ہے اس سے نکل آ نہیں تو ڈوب مرے گا"۔

"لیکن نسیم؟ ـــــ وہ بیچاری تو ـــــ"

اس کی نظروں کے سامنے بدشکل گنڈویا سی نچڑی نچڑی بھنی بھنی مردہ سی نسیم آ گئی ـــ کچی سیون کی طرح جا بجا ادھڑی ہوئی نسیم ـــ

"یہ بے چاریاں ہوتی ہی ایسی ہیں ـــ قدموں میں بٹھاؤ تو چھال مار کر گودی میں آ بیٹھتی ہیں ـــ انگشتری میں دیگ کا پانی نہیں ڈالتے ـــ یہی مت ہے تم مردوں کی

جب تم کو ڈوب مرنے کے لیے چلّو بھر پانی نہیں ملتا تو پھر تم لوگ چلّو بھر عورت میں ڈوب مرتے ہو، ہمیشہ کے لیے ___ اگر اس سے بیاہ کرو گے تو میں جان سے مار دوں گی۔"

نسیم سے بیاہ؟

اس کے لیے یہ خبر ہی وحشت ناک تھی۔

بیاہ کا نام سن کر وہ دیر تک ہنستا رہا۔ ہولے ہولے۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آہستہ آہستہ گالوں پر بہنے لگے۔ اس کے باپ نے ساری عمر آدرشوں سے بڑی محبت کی تھی۔ اخوّت کا سبق ___ حب الوطنی کا سبق ___ ایثار و محبت کی تعلیم دی تھی۔ ان آدرشوں کی کمزور محبت پتہ نہیں کن راستوں سے سفر کر کے اس تک آ گئی تھی۔

وہ ہولے ہولے ہنستا رہا اور آنسو اس کی گالوں پہ بہتے رہے۔

"دادی ماں ___ یہ بات تمہارے ذہن میں آئی کیسے ___ یہ خواب تو نسیم نے بھی کبھی نہیں دیکھا ہوگا!"

"اس نے یہ خواب دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو، تُو نے ضرور دیکھا ہوگا۔ مردوں کی ایسی ہی مت ہے۔ تُو کونسا اپنے باپ سے کم ہے!"

ابراہیم بڑے اکیلے پن سے اٹھا اور تیسری منزل پر جا رکا۔

دادی بے چاری آنسوؤں کے ایک ہی معنی جانتی تھی۔ محرومی ___ نارسائی ___ آرزومندی ___ دادی کے انتزدھیان سے بھی پرے تھا کہ کبھی کبھی ایسے آنسو بھی آ جاتے ہیں جو دوسروں کی آنکھوں سے مستعار لیے ہوتے ہیں۔ ابراہیم جو گھرے کرب سے جھلاجھل رو دیا تو وہ اپنی محرومیوں کے آنسو نہ تھے بلکہ یہ وہ منجمد آنسو تھے جو آج تک نسیم اپنی حالت پر بہا نہ سکی تھی۔ جو ممو اور منظور کی آنکھوں میں کبھی کے سوکھ چکے تھے۔

ابراہیم لمحے کا آدمی تھا۔ اسی لیے اس نے فیصلہ بھی اسی لمحے کیا کہ وہ پھر منظور کے

گھر نہیں بجانے گا۔ اس کی وجہ کچھ یہ نہ تھی کہ وہ وادی سے بد گمان تھا۔ اس کی وجہ کچھ یہ بھی نہیں تھی کہ اب وہ نسیم کا بننے سے انکاری تھا —— بلکہ یکدم اس پر یہ حقیقت کھلی تھی کہ اگر بدنامی کی باتیں کسی طور پہ کسی موسمی پھل کے ساتھ ساتھ بوڑھی دھموں کے کانوں میں جا پہنچیں تو اس آسیب دیدہ عورت کا کیا بنے گا۔ ایک قیامت آجائے گی —— حویلی میں نہیں —— منظور کے گھر میں بھی نہیں —— بلکہ ملک ابراہیم کی ذات میں۔

اس کی طرف وہ ایک بار بلاوا آیا۔ کبھی کبھی منظور کے ساتھ گلی میں ٹاکرا بھی ہو جاتا لیکن اس نے اس پالان کو دوبارہ اپنی پیٹھ پر نہیں لادا —— اس بندر آشنائی سے جو دکھ دھموں کے خاندان کو ہوا ہو گا وہ ایک اور دکھ بھری کہانی ہے جو انسانی دلوں پر گزرتی ہی رہتی ہے لیکن وادی کے ایک ہی دھکے سے ابراہیم کی عزت بحال ہو گئی اور اس کی گرانڈیل مینا وتی جیسی ماں نے سکھ کا سانس لیا۔

کئی سال گزرنے پر اس شام ایک فیصلہ کن واقعہ اور ہوا۔

شہ نشین پر کھڑے ہو کر اس نے حضرت امام حسین کے گھوڑے کو دو گلی پیچھے امام باڑے سے نکلتے دیکھا تھا۔ صندلی خوبرو جوان، سیاہ لباسوں میں، دیوانہ وار ساتھ جا رہے تھے۔ سب کی آنکھوں سے ایسے آنسو رواں تھے جنہیں وادی نہیں جانتی تھی۔ ساری گلی میں پاؤں ٹکانے کی جگہ نہ تھی۔ امام باڑے سے اندھی شام میں بین کرنے والوں کی آہ و بکا زخمی ہو کر اوپر شہ نشین تک آ گئی تھی۔ گلی میں کوئی کوئی گھر روشن ہو گیا تھا لیکن بجلی کے کھمبوں پر روشنی نہ ہوئی تھی۔ کوٹھوں پر عورتیں دوہری بکلیں مارے ایک اور عہد میں زندہ دم بخود گردنیں جھکائے نیچے گلی میں دیکھ رہی تھیں۔

ہوا میں گرمی تھی سانسوں کی —— آہوں کی —— آدرشوں کی —— ایک بیتی گھڑی کے سوگ کی پکار ہر طرف پھیلی تھی۔ انسان کو اگر پوری طرح خوشی راس آ بھی جائے تو بھی وہ غم کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ کئی غم ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا ذاتی خوشی یا اس

کے فقدان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ـــــ اندر ہی اندر یہ شفا بخشنے والا غم روح کو اُجلا کرتا ہے ..... حضرت مسیحؑ کا سوگ ..... کربلا کے واقعہ کا بین ..... دیوار گریہ کے آنسو ..... مہارانی سیتا کے بن باس کا غم .....

لیکن دادی کیسے سمجھ سکتی تھی کہ انسان نے اپنی تمام خوشیوں کے اوپر غم کا سائبان تان رکھا ہے ـــــ اور وہ اس سائبان تلے آنند کی گھڑیاں گزار سکتا ہے۔

پھر غم حسینؓ میں سال بھر کے لیے شفایاب ہونے والے اس کی گلی میں سے گزرنے لگے ـــــ شام ہو چکی تھی لیکن ابھی تک ہوا میں جھلس دینے والی گرمی تھی ـــــ تمام لوگ گرمی اور کچھ آدرش کے غم میں نڈھال تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ بالوں میں دھول تھی ـــــ تمام ماتم کناں پیاسے تھے۔

ابراہیم شہ نشیں پر ٹانگ دھرے نیچے دیکھ رہا تھا لیکن وہ ملحے کا آدمی تھا۔ ثانیے کی سوچ کے تابع تھا۔ وہ ننگے پاؤں نچلی منزل میں پہنچا۔ گھر خالی اور سنسان تھا۔ اس نے جگ میں ٹھنڈا پانی انڈیلا اور آنسوؤں کے سواگت کے لیے گلی میں پہنچ گیا۔ وہ کئی بار جگ لایا اور کئی جگ لایا۔ لوگ آہستہ آہستہ گھروں کو رخصت ہو گئے۔ کھمبوں کے بلب جل اٹھے۔ عورتیں کوٹھوں سے اتر گئیں اور شام غریباں کا نوحہ ایام باڑے سے آنا بند ہو گیا۔ ترساں و خیزاں کئی جوان گلی میں سے آہیں بھرتے چلے گئے ..... لوگوں کی گنجار کسی دوسری گلی میں منتقل ہو گئی لیکن ابراہیم بغلی پھاٹک کے سامنے اس وقت تک کھڑا رہا جب تک اسے دادی اماں کا بلاوا نہ آ گیا۔

وہ پانی کے جگ سمیت اوپر گیا ـــــ

دادی کے بوڑھے ہونٹوں پر تازہ پان کی سرخی تھی اور اس کے ابروؤں کے درمیان غصے کی بھاری لکیر تھی۔

"تجھے کیا ہو گیا ہے ابراہیم ـــــ"

وہ چپ چاپ پائنتی بیٹھ گیا اور دادی دیر تک بھینس کی طرح منہ ہلاتی رہی۔

"تجھے ہوا کیا ہے؟"

"کیا ہوا ہے مجھے؟"

"کبھی ایسے ہوا ہے پہلے؟"

"کیا نہیں ہوا دادی؟"

"تجھے ذرا بھی ملکوں کی عزت کا پاس نہیں! ـــ یہ سوشل سروس نہیں ہے ابراہیم تُو اپنی انا کی تسکین کر رہا ہے غلط طریقوں سے ـــ تیرا باپ دودھ کی سبیل لگوا تا تھا دسویں کو۔ ہمارے ہاں سے جو ختم دلایا جاتا ہے اس کا کوئی مقابلہ ہے ـــ لیکن اپنے ہاتھ میں جگ پکڑ کر پانی پلاتے پھرنا ـــ توبہ ـــ!"

"غم کی پذیرائی کے لیے خود نہ نکلتا دادی ماں ـــ خشک چہروں کے لیے تھوڑا سا پانی اپنے ہاتھوں میں لے کر نہ جا سکتا ـــ میں تو انسانوں کے سانجھے دکھ کو سلام کرنے نکلا تھا دادی ـــ"

"میں ـــ میں کیا کہوں اب۔ لاکھوں خرچ کیے تیرے باپ نے۔ ہزاروں گھر بساتے پر نہ اپنا مسلک کبھی چھوڑا نہ کسی اور کا چھیڑا ـــ اس نے بھی بنی نوع کی بڑی خدمت کی تھی ـــ پر تیری طرح اپنی ذات کے غبارے میں گیس کبھی نہیں بھری تھی ـــ یہ سب کیا سمجھتے ہوں گے گلی والے ـــ معمولی لوگ ـــ ان سے تو ہماری بول چال بھی نہیں ہے ـــ تُو نے اپنے ہاتھوں سے انہیں پانی پلایا ـــ توبہ توبہ ـــ تجھے ہر اُلٹے کام کا کتنا شوق ہے ابراہیم ـــ"

"میں جا رہا ہوں دادی اماں ـــ آپ کا وطن چھوڑ کر ـــ میں ایسے حالات میں اب یہاں ایک منٹ نہیں رہنا چاہتا ـــ"

"کیوں ـــ کیا ہوا ہے تمہارے وطن کو؟ ـــ جنگ چھڑ گئی ہے؟ ـــ سیلاب

آگیا ہے ؟ کوئی اندرونی فسادات شروع ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے بھاگ رہے ہو"۔

"جہاں خاکروب کو آپ کی ناپاکی صاف کرنے کے ساتھ ساتھ نفرت کا صلہ بھی ملے۔ جہاں ستر سالہ تائب طوائف کو پاکیزگی کا بوجھ اور عبادت کی سختی بھی جھیلنا پڑے اور گجری کی نحیف صدائیں بھی اس کے نحیف وجود کو تھپکتی رہیں۔ جہاں بہتر فرقے باآوازِ بلند پکاریں کہ مسیحِ موعود آنے والے ہیں مگر ایک تہترواں فرقہ اگر کہہ بیٹھے کہ وہ آچکے ہیں تو اقلیت ——— ! یہاں میں نہیں رہ سکتا دادی ماں۔ نہیں رہ سکتا ——— ہمارے معاشرے میں غریبی گالی، بیٹی بوجھ ——— ذات پات عین دین ہے دادی ماں ——— میں کسی ایسے ملک میں چلا جاؤں گا جہاں کا نہ معاشرہ میرا ہوگا نہ اس کا قانون میں نے تشکیل دیا ہوگا ——— وہاں میں صرف اپنے گناہوں کا جوابدہ رہوں گا اگر جرم کروں گا تو صرف خود سزا پاؤں گا ——— گمراہ ہوں گا تو اکیلا میں اس معاشرے کے گناہوں اور جرائم کی شرمساری اپنی گردن پر لے کر مرنا نہیں چاہتا۔ چلئے آپ مجھے بزدل کہہ لیں ——— ایسا ہی ہے ——— میں اگر اس تنگ نظر، تنگ اوقات معاشرے کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو یہاں سے ہجرت تو کر سکتا ہوں ؟ ——— ہجرت تو کر سکتا ہوں ! ——— ہجرت تو کر سکتا ہوں؟"

اس رات ———

جب پچھلی گلیوں سے ابھی بھی رونے کی آوازیں آرہی تھیں، ابراہیم اپنا سامان باندھتا رہا۔

یہ بھی سنا گیا ہے کہ ملک ابراہیم جب ایک بار سوئٹزرلینڈ چلا گیا تو اس نے حویلی والوں کو پلٹ کر کوئی خط نہیں لکھا۔ اس کی ماں جس کا شکٹ سکّہ ساری حویلی میں چلتا تھا رانی بیناوتی کی طرح سارے کمروں میں بین ڈالا کرتی تھی لیکن اس کا ماتم کچھ اور ہوا کرتا۔ وہ ہر ایک سے کہتی :

"ابراہیم کو تو ابھی میں نے بیاہنا تھا۔ ابھی تو اس کی کوئی خوشی پوری نہ ہوئی تھی پھر

وہ کس لیے ماں کو چھوڑ گیا ـــــ کس لیے اس نے جلاوطنی اختیار کی؟ ـــــ اس کے چندن سے بدن نے کوئی سکھ نہیں دیکھا ـــــ کیا کرتا ہوگا پردیس میں میرا ابراہیم؟'

لیکن جب آدمی اپنے آدرشوں کو نہ تحریکوں میں ڈھال سکے نہ قدم قدم ان کے ساتھ چل سکے تو پھر جوگ لیے بغیر اور کونسا چارہ رہ جاتا ہے؟ کہتے ہیں جس روز راجہ گوپی چند نے ملکوں کی حویلی سے نکل کر جوگ لیا اور کرم بھوگ پورا کر لیا، اس رات ہلکا سا زلزلہ لاہور شہر میں آیا تھا ـــــ باقی شہر تو سلامت رہا صرف منظور کے گھر کی چھت گر گئی اور اس کے ملبے تلے کرسی سمیت نسیم دفن ہو گئی ـــــ

حویلی والوں کا بیان ہے کہ حویلی میں زلزلہ محسوس تک نہ ہوا ـــــ صرف آنگن میں بنی ہوئی ملک ابراہیم کے باپ کی قبر میں ایسا شگاف آ گیا تھا جس سے آہستہ آہستہ پانی رِستا رہتا تھا!

قطرہ قطرہ ـــــ

بوند بوند ـــــ

آنسو آنسو ـــــ

---

# چمو

میں نے اسے پہلی بار بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی دیکھا تھا اور بیگم صاحبہ سے میری ملاقات ایک دن اتفاقاً ہو گئی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ ہم سب سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ گرمیوں میں یہ تیاریاں بڑی طول طویل ہوتی ہیں۔ بستر باہر نکالے جاتے ہیں۔ گھڑوں میں پانی بھرا جاتا ہے۔ پنکھوں کی تلاش ہوتی ہے۔ مسہریاں تانی جاتی ہیں اور پھر بھی نیند ہے کہ کسی خوش قسمت ہی کی آنکھوں میں بسرام کرتی ہو گی۔

میں اپنا دوپٹہ بانہوں پر لپیٹے پڑی تھی کیونکہ مچھروں کا دستہ بار بار یورش کر رہا تھا اور گرمی کا یہ عالم تھا کہ چادر اور مسہری میں دم گھٹتا تھا۔ امی قریب ہی جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پنکھی اٹھا لیتیں۔ دوپٹے سے گردن پونچھتیں اور پھر بڑی بد دلی سے سر جھکا کر نماز پڑھنے لگتیں ـــــ یہ وقت کسی کو ملنے کا نہ تھا لیکن کبھی کبھی اچانک کسی ایسے انسان سے ملاقات ہو جایا کرتی ہے جیسے کوئی سیارہ گھومتا پھرتا آپ کے محور پر آ نکلا ہو۔

کار کی بتیاں پھاٹک پر لہرائیں پھر انجن بند ہو گیا اور پھر اپنا آپ دھکیلتی ہوئی کار پورچ